(غلام گردش)

کیا ہم صرف تنقید کر سکتے ہیں؟

سیاست پر بہت کم لکھتا ہوں۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس میدان میں جانے کا کبھی سوچا ہی نہیں۔ایک وجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر لکھنے والے بہت بڑے بڑے دانشور اور قلمکار موجود ہیں۔مگر تعصب سے بالاتر ہو کر معروضات پیش کرنے والے لوگ آٹے میں نمک سے بھی کم ہیں۔عملی صورتحال یہ ہو چکی ہے کہ صرف نام پڑھ کر یا صرف تصویر دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ موصوف کس سمت میں باتیں کرینگے۔بدقسمتی تو یہ بھی ہے کہ پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں کالم یا ٹی وی پروگرام کسی منفعت کے تحت پیش کیا جا رہا ہے یا برعکس۔پاکستان اتنا بڑا حمام بن چکا ہے کہ یہاں ابھی تک کپڑے اُتار کر برہنہ ہونے کی گنجائش سو فیصد موجود ہے۔برہنہ کا متبادل لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ایسا سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ پہلا عنصر تو خیر پیسہ ہی ہے۔دولت کے ہتھیار سے کوئی بھی کھوٹا سکہ خرید کر کھرا بنایا جا سکتا ہے۔ ہر عہدہ، شخص اور درباری "برائے فروخت" کا بورڈ سجا کر چوک میں بیٹھا ہوا ہے۔پیسے کے علاوہ، ایک اور اَمر بھی سچ بنکر سامنے آ چکا ہے۔وہ ہے کہ ہم کسی بھی کام کرنے والے ادارے، سیاستدان یا شخصیت پر بے جا تنقید کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔اسکا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اب کسی کی بھی جائز تعریف کرنے کی استطاعت کھو چکے ہیں۔اردگرد دیکھیے۔منفی رجہانات پورے ملک کو گرفت میں لے چکے ہیں۔ہوسکتا ہے کہ آپکو لگے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔مگر دلیل کی بنیاد پر پرکھیے۔شائد یقین آ جائے۔شائد۔

اس وقت قومی سطح کے تین لیڈروں کا یکے بعد دیگرے، بغیر تعصب کے جائزہ لیجئے۔کارکردگی کی بنیاد پر ہم اس قابل ہو جائیں کہ کچھ کہہ سکیں۔نواز شریف، عمران خان اور آصف علی زرداری ہمارے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی ملک کی سیاست میں بھرپور وزن رکھتے ہیں۔انکی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلمہ ہے۔موجودہ سیاسی میدان ان افراد کے بغیر مکمل طور پر اُدھورا ہے۔تعجب صرف ایک بات پر ہے۔ہم پسندیدہ شخص کو فرشتہ بنا دیتے ہیں اور سیاسی مخالف کو شیطان۔بنیادی طور پر یہ بھی انتہا پسندی کا ایک رویہ ہے۔چلیے عمران خان سے بات شروع کیجئے۔سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک خان، پوری دنیا میں پاکستان کی پہچان بن چکا تھا۔سپر سٹار کی حیثیت سے مغربی اور مشرقی دنیا میں لوگ اسکے دیوانے تھے۔جاندار کھیل اور اسکی شخصیت، تمام دنیا کو متاثر کر چکی تھی۔لازم ہے کہ جوانی میں وہ ساری غلطیاں کی ہونگیں، جو تمام جوان کرتے ہیں۔مگر آہستہ آہستہ اسکے اندر ٹھہراؤ آتا گیا۔2013 کے الیکشن سے چند ہفتے قبل آسٹریلیا جانے کا اتفاق ہوا۔سڈنی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا اسکے برابر کے منتظم سے ملاقات ہوئی۔رسمی ملاقات کے بعد اس شخص نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔معلوم ہوا کہ آسٹریلیا کی ایک ریاست کا نوجوان ترین گورنر رہا ہے۔سیاست سے جی اُکتایا تو استاد بن گیا اور شعبہ تعلیم سے منسلک ہو گیا۔بیس برس پڑھانے کے بعد یونیورسٹی کے ہیڈ منتظم کے عہدہ پر پہنچ گیا۔پاکستان کی داخلی سیاست میں دلچسپی غیر معمولی تھی۔تیسری دنیا میں ایک دور دراز ملک کے متعلق معلومات حیرت انگیز تھیں۔اس نے صرف ایک سوال پوچھا کہ الیکشن عمران خان جیت جائیگا یا نہیں۔ہر ایک نے اپنی اپنی وابستگی کے حساب سے جواب دیا۔طالبعلم نے اس سے پوچھا کہ آپ آسٹریلیا کے رہنے والے ہیں۔سیاست اور شعبہ تعلیم سے وابستہ ہیں آپکا عمران خان سے کیا تعلق۔جواب بے حد سنجیدہ تھا۔کہنے لگا جب مجھے پتہ چلتا تھا کہ پاکستان

کی کرکٹ ٹیم آرہی ہے تو ائیر پورٹ پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی عمران خان باہر نکلتا تھا، اسکی تصویریں کھینچتا تھا۔ اسکے پہنے ہوئے کپڑوں کی نقل کر کے اپنے کپڑے سلواتا تھا۔ خان، ایسے لگتا تھا کہ ہزاروں سال پرانا کوئی یونانی دیوتا ہو۔ وائس چانسلر کی باتیں حیران کن تھیں۔ آدھا گھنٹہ صرف خان کی تعریفیں کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا کہ اس الیکشن میں اگر ملک کا وزیراعظم نہ بن پایا تو اگلے الیکشن میں ضرور بنے گا۔ بہرحال یہ ایک ایسے گورے کے جذبات تھے جو کبھی ہمارے ملک نہیں آیا تھا۔ مگر خان کی وجہ سے ملک کی عزت کرتا تھا۔ قصہ سنانے کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ خان، ایک لحاظ سے ہمارے ملک کی پہچان بن چکا ہے۔ لندن کے کسی سنجیدہ انسان سے بات کیجئے۔ آپکو ضرور بتائیگا کہ سر گولڈ سمتھ کی جائیداد کے تین سے چار بلین پاؤنڈ، خان نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ شائد شرط یہ تھی کہ پاکستان چھوڑ کر لندن آجائے۔ جو بندہ اتنی بڑی جائیداد کو ٹھوکر مار کر اپنے ملک واپس آسکتا ہے، کیا واقعی وہ کسی سے بھی ایک پیسے کا بھی روادار ہوسکتا ہے۔ گمان ہے کہ بالکل نہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عمران خان، متعدد غلط فیصلے کر جاتا ہے۔ مگر وہ قطعاً بے ایمان انسان نہیں۔ یہی اسکی طاقت ہے اور اسی وجہ سے اسکی باتوں پر لوگ دھیان دیتے ہیں۔ ذرا سوچیے، کہ اگر ملکی سطح پر ایک کلیدی کردار ادا کرسکتا ہے، تو اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ قطعاً عرض نہیں کر رہا کہ وہ فرشتہ ہے۔ مگر اسکی موجودگی سے ملک کو فائدہ ہوسکتا ہے۔ تو کیوں نہیں۔ غلطیاں وہ روز کرتا ہے۔ یہ اسکی میڈیا ٹیم کا کام ہے کہ خامیوں پر نظر رکھے اور انہیں دور کرنے کا مشورہ دے۔ اسکی ذات اگر ملک کے قرضے واپس کروانے کیلئے ایک جاندار کردار ادا کرسکتی ہے، تو اس سے فائدہ اُٹھانے میں کیا حرج ہے۔ یہ بھی عرض کرونگا کہ اسکی موجودگی میں سیاسی ٹیم کا کوئی بندہ رشوت نہیں لے سکتا۔ بہرحال یہ مستقبل کی باتیں ہیں۔ ویسے خان صاحب سے یہ ضرور اختلاف ہے کہ جہاں بھی شوکت خانم ہسپتال کا ذکر کرے۔ یہ بھی بتانا چاہیے کہ ہسپتال کی زمین دینے میں نواز شریف کا بہت بڑا کردار ہے۔ مگر آج تک خان یا انکے ساتھیوں نے اسکا برملا اعتراف نہیں کیا۔ طالبعلم کی نظر سے یہ ایک بہت بڑی شخصی کمزوری لگتی ہے۔ جس نے بھی اچھا کام کیا، اسکا اعتراف ہونا چاہیے۔

عرض کرتا چلوں۔ پوری زندگی میں صرف ایک بار ووٹ دیا ہے۔ اس الیکشن میں خیر ووٹ ضرور ڈالوں گا۔ فیصلہ نہیں کر پایا کس کو اور کیوں۔ بہرحال یہ ایک ذاتی سی بات ہے۔ عمران خان کے متعلق تھوڑا سا لکھنے کے بعد، نواز شریف کی طرف آیئے۔ الزامات کی بوچھاڑ کو ایک طرف رکھیے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ جب میاں صاحب نے نوے کی دہائی میں لاہور سے اسلام آباد، موٹروے بنانے کا فیصلہ کیا تھا تو ایک قیامت برپا کر دی گئی تھی۔ اس وقت کی پیپلز پارٹی نے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ موٹروے صرف ایک شاندار سڑک نہیں بلکہ وسطی پنجاب کی ترقی کی بنیاد بن گیا۔ موٹروے کے اردگرد کے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور شہروں نے بے حد ترقی کی۔ لوگوں کے سفر کرنے کے اطوار بدل گئے۔ موٹروے پر سفر کرتے ہوئے دل چاہتا ہے کہ اسکے بنانے والے وزیراعظم کی تعریف کی جائے۔ درست ہے کہ فیصل آباد تک موٹروے پرویز مشرف نے بنوایا۔ مگر جس سیاستدان نے اس بڑے کام کو ملک میں شروع کروایا، اسکی بھی تعریف ہونی چاہیے۔ لاہور کی طرف آیئے۔ کیا پورے لاہور شہر کو بہتر نہیں بنایا گیا۔ یہ بھی ماننا چاہیے کہ پرویز الٰہی نے اپنے دور میں بے پناہ ترقیاتی کام کروائے۔ مگر لاہور کو وسطی ایشیا کا نمایاں شہر بنانے میں کیا شہباز شریف کا ہاتھ نہیں ہے۔ اگر نواز شریف

کی آشیر یاد نہ ہوتی، تو کیا یہ کام ہوسکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ تنقید ضرور کریں۔ یہ آپکا حق ہے۔ مگر کام کو دلیل کی روش پر پرکھیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نواز شریف نے جن افسران پر عنایات کی بارش برسائی، کڑے وقت میں ان میں سے اکثریت ان سے پہلو بچانے لگی۔ بابوؤں نے ان لوگوں کے طفیل ہر دنیاوی فائدہ حاصل کرلیا۔ اب "وعدہ معاف گواہ" بننے کی جلدی میں ہیں۔ "سرکاری بچہ پارٹی" نے شریف خاندان سے ہر فائدہ حاصل کیا اور پھر وہی کیا، جو ادنیٰ لوگ کرتے ہیں۔ مشکل بات یہ ہے کہ نواز شریف کے سیاسی زوال میں سرکاری بابوؤں کی غیر سنجیدہ ٹیم کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ شائد شہباز شریف سینئر افسروں سے دور اس لیے رہتے تھے کہ وہ انکی بات کے جواب میں قانون یا رولز کی بات کرتے تھے۔ انتہائی خام افسروں نے پورے خاندان کو دنیاوی عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ تو خیر انکا نصیب ہے۔ مگر پاکستان میں ہر بڑے منصوبہ پر نواز شریف کی چھاپ موجود ہے۔ اسکے برعکس ایک مضبوط نکتۂ نظر یہ بھی ہے کہ ان منصوبہ جات میں ذاتی فائدے کیلئے بھی کام کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ اس پر تفتیش کرنے کیلئے کئی ادارے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے منصوبہ جات کو بنانا ہرگز ہرگز معمولی کام نہیں۔ اسکی جائز تعریف نہ کرنا تو درست بات نہیں۔ زرداری صاحب پر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

سیاست کا المیہ یہ ہے کہ ہر لیڈر کے پیروکار، لیڈر کو انسان سے اوپر کا درجہ دے چکے ہیں۔ سوچنے کیلئے تیار ہی نہیں کہ ہر بشر کی طرح قائدین میں مثبت اور منفی پہلو، دونوں موجود ہیں۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ کون سا سیاستدان ملک کیلئے بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔ ہاں، فرشتہ یہاں کوئی بھی نہیں۔ دودھ کا دھلا کوئی بھی نہیں۔ نہ کوئی شخصیت اور نہ کوئی ادارہ۔ ہر جگہ اپنے اپنے قد کاٹھ کے حساب سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ ان سب کا خمیازہ ہم اگلے کئی برسوں تک بھگتتے رہینگے۔ مگر سوچنا چاہیے کہ اب کیا کرنا ہے۔ معمولات کو آگے لیکر کیسے جانا ہے۔ سفاک حقیقتوں کے پہاڑوں کو کیسے عبور کرنا ہے۔ کیا قوی حکومت سے مسائل حل ہوجائینگے یا مزید بڑھ جائینگے۔ ان سوالات کا جواب خود آنے والا وقت دیگا۔ مستقبل کے فیصلے کی صرف ایک بنیاد ہونی چاہیے کہ پاکستان کا مقدمہ کون بہترین طریقے سے لڑتا ہے اور جیتتا ہے۔ باقی سب کچھ غیر اہم ہے۔ کہیں، ہماری مسلسل غلطیوں سے ملک ہی غیر اہم نہ ہوجائے!

راؤ منظر حیات